خواجہ عبدالحمید یزدانی

مثنوی رومی میں ذکرِ خیر الانام صلی اللہ علیہ وسلم

مثنوی رومی کے دفتر دوم میں ایک صوفی، اس کے خادم اور گدھے کی داستان بیان ہوئی ہے۔ یہ صوفی ایک شب کسی خانقاہ میں آ کر ٹھہرتا ہے۔ گدھے کو تھان پر باندھتا اور خود دوسرے صوفیا کے ساتھ وجد و حال کی مجلس میں جا بیٹھتا ہے۔ مجلس ختم ہونے پر وہ خادم کو گدھے کی خوراک وغیرہ کے بارے میں ہدایات دیتا ہے۔ کام چور خادم ہر ہدایت پر لاحول پڑھ کر اس کام سے جی چرانے کی کوشش کرتا ہے۔ صوفی سفر کا تھکا ہارا سو جاتا ہے اور گدھا بھوکا رہ جاتا ہے۔ دوسرے دن صبح خادم بھوکے پیاسے گدھے پر پالان کستا اور اسے مارتا پیٹتا ہے۔ جب صوفی اگلے سفر کے لیے گدھے پر سوار ہوتا ہے تو وہ بھوک سے نڈھال ہونے کے سبب راستے میں گر گر پڑتا ہے۔ لوگ ہر مرتبہ اسے اٹھا دیتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ وہ بیمار ہے۔ یہاں مولانا اس خادم کی مثال سامنے رکھ کر مکار و فریب کار لوگوں کو آدم خوار اور ابلیس سے بھی بڑھ کر دشمنِ انسان قرار دیتے ہیں ان ناجنسوں کی چاپلوسی اور دوستی سے بچنے کی تلقین کرتے ہیں۔ پھر اسی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے حکمتِ بعثتِ انبیا اور سورۃ والضحیٰ کے حوالے سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں، ان "ناجنس" مردم خوار انسانوں کے لیے مسلمان، یہود، کافر اور مومن، نیک و بد اور کفر و دین سب برابر ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انبیا علیہم السلام کو اس لیے بھیجا کہ وہ کفر و دین میں فرق کو ظاہر کریں۔ دنیا تاریک تھی اور انسان کی کیفیت شب رو کی طرح تھی، تا آنکہ آفتابِ انبیا طلوع ہوا اور ساری تاریکی چھٹ گئی۔ یہ انبیا گویا آنکھ ہیں جو رنگوں میں تمیز اور لعل و سنگ میں فرق کر سکتی ہے۔

پھر مولانا رومی آفتاب کی رعایت سے روز (دن) کا ذکر کرتے اور ان مکار ناجنسوں کو دشمنِ روز کہتے ہیں، جبکہ یہ انبیا "عاشقِ روز" ہیں۔ اس لیے کہ روز اس محبوبِ حقیقی کی تعریف کا آئینہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قیامت کو اس لیے "روز" (یوم) کے لفظ سے پکارا ہے کہ دن کے وقت ہر اچھا، برا اور سیاہ و سفید، روشن و عیاں نظر آتا ہے۔ شبِ قیامت نہیں کہا کہ قیامت کا مقصد ہی یہ ہے کہ ہر کسی کی سیرت کا اصلی رنگ نمایاں ہو جائے۔ مادی اشیا میں بھی تمیز دن ہی کے وقت ہو سکتی ہے، ورنہ رات کے وقت، بقول شیخ

تمام جانور یک رنگ ہوتے ہیں[1]۔ اس لحاظ سے دن، اولیاء اللہ کا راز اور ان کے خورشید کے سامنے گئی سالوں کا ہے۔ اب مولانا "روز" کو مردانِ حق کا راز اور رات کو اللہ جل جلالہ کی ستاری کا عکس قرار دیتے ہوئے "والضحیٰ"[2] کا حوالہ لائے ہیں۔ ان کے مطابق اس سے مراد یہی صبح ہے اور دوسری کے مطابق اس کا مطلب حقیقتِ ہوی و نورِ محمدی ہے[3]۔ ان اشعار میں مولانا کا اشارہ اسی طرف ہے۔ وہ دونوں اقوال ہیں بقا کو اہم عنصر جانتے اور اس صبح کو اس کا عکس قرار دے کر گویا دونوں اقوال کو صحیح گردانتے ہیں، اس لیے کہ فانی اشیا کی قسم کھانا چہ معنی، اور پھر اللہ تعالیٰ کے نزدیک فنا اور اشیائے فانی کی کیا وقعت؟

شروع شروع میں جب حضرت ابراہیم خلیل اللہ نے ستارے کو دیکھا تو اُسے اپنا خدا جانا لیکن جب وہ غروب ہوگیا تو فرمایا میں غروب و زائل ہونے والے کو خدا نہیں مانتا۔ مولانا سورۂ انعام میں مذکور اس واقعہ کی طرف اشارہ کر کے کہتے ہیں کہ جب ایک دوست نے زائل ہونے والی چیز سے کوئی لگاؤ نہ رکھا تو اللہ جل شانہٗ کیونکر اسے (فنا، فانی شے کو) پسند فرمائے گا ... اس حصے میں مولانا نے گویا سورۂ والضحیٰ کی کسی قدر تفسیر بیان کی ہے:

دشمن روزند این قلاّ بگان	عاشقِ روزند این زرہای کان
زانکہ روز است آئینۂ تعریف او	تا ببیند اشرفی تشریف او
حق قیامت را لقب زان روز کرد	روز بنماید جمال سرخ و زرد
پس حقیقت روز سِر اولیاست	روز پیش مہرشان چون سالہاست
عکس راز مردِ حق دانید روز	عکس ستاریش شامِ چشم دوز
زان سبب فرمود یزدان "والضحیٰ"	والضحیٰ نورِ ضمیر مصطفیٰ
قول دیگر کاین ضحیٰ را خواست دوست	از برای اینکہ آن ہم عکس اوست
ورنہ بر فانی قسم خوردن خطاست	خود فنا چہ لائقِ گفتِ خداست

---

[1] تشبیہاتِ رومی، ص ۱۷۱

[2] سورۂ والضحیٰ، قسم ہے دن کی روشنی کی اور رات کی جب کہ وہ قرار پکڑے، کہ آپ کے پروردگار نے نہ آپ کو چھوڑا اور نہ آپ سے دشمنی کی... الخ

[3] مثنوی، دفتر ۲۔ حاشیہ، ص ۸

از خلیل لا احب الآفلین .. پس فنا چوں خواست رب العالمین
لا احب الآفلین گفت آن خلیل کی فنا خواہد ازین رب جلیل[۵۴]

اس دفتر میں ایک بادشاہ کے باز اور ایک بڑھیا کی کہانی کے ذیل میں مولانا نے کئی ایک موضوعات۔ عبادت و قرب پر مغرور نہ ہونا، آثار عنایتِ الٰہی اور آرزو چاہنا کامیابی کی نشانی ہے .. وغیرہ — پر اظہار خیال کیا ہے۔ اس حصے میں احمدؐ کے لقب سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر چند ایک مرتبہ آیا ہے۔ مختلف پیغمبروں مثلاً حضرت نوح، حضرت موسیٰ علیہم السلام کے معجزات اور ان پیغمبروں[۵۵] پر عنایاتِ الٰہی کا ذکر کرتے ہوئے مولانا نے نبی اکرم کے لیے دینوی جاہ و حشمت اور مال و لشکر کو بے وقعت ٹھہرایا ہے۔ پھر حضورؐ کے معجزہ شق قمر کی طرف اشارہ کر کے اس دور کو "دورِ قمر"[۵۶] کی بجائے دورِ احمدؐ کہا ہے۔ اور کہتے ہیں کہ یہ آنحضرتؐ ہی کا دور ہے اور حضرت موسیٰ کلیم اللہ کو بھی ہمیشہ اس دور کی آرزو رہی[۵۷]۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ نے نبی کریم کے دورِ سعادت پرتو کی جلوہ سامانی دیکھ لی تھی جس میں "صبح تجلی" طلوع ہو رہی تھی۔ چنانچہ حضرت موسیٰ کے عرض کرنے پر کہ یہ دور تو رؤیت و دیدار کا ہے جو بہرۂ خاصانِ خدا ہے، ارشادِ ربانی ہوا کہ میں نے تجھے یہ

---

[۵۴] کتاب مثنوی، ص ۱۱۳، مثنوی، دفتر ۳، ص ۱۰۹

[۵۵] ان پیغمبروں کا ذکر تو صیغۂ مغائب میں ہے لیکن حضور اکرمؐ کے سلسلے میں خطاب کا انداز اپنایا ہے۔

[۵۶] دورِ قمر: بعض متقدمین کا یہ اعتقاد تھا کہ دنیا کی عمر سات ہزار برس ہے۔ انھوں نے ہر ہزار برس کا ایک دورہ بنا کر اسے کسی نہ کسی سیارے سے منسوب کر رکھا تھا۔ آغاز انھوں نے ستارۂ کیواں سے کیا اور اسی طرح بقیہ دور دوسرے سیاروں ستاروں کے ناموں سے معروف ہوتے۔ اس لحاظ سے حضور اکرم کا ظہور دورِ قمر میں ہوا، رومی نے اسی عقیدے کی بنا پر یہ بات کہی ہے۔ مدتِ مدید ہوئی دورِ قمر ختم ہو چکا۔ اب دورۂ زحل کا آغاز ہے۔ (خلاصۂ مثنوی، ص ۲۳۹)

[۵۷] یہ ایک حدیث کی طرف اشارہ ہے جس کے مطابق اللہ تعالیٰ نے کسی امت کی تعریف میں ایک سو چودہ مرتبہ ندا فرمائی ہر مرتبہ حضرت موسیٰ کو گمان گزرا کہ اللہ تعالیٰ ان کی امت کی بات کر رہا ہے اور ان کے دین کے پیرو کاروں کی تعریف فرما رہا ہے جس پر انھیں بتایا گیا کہ یہ امتِ احمد کی بات ہے۔ حضرت موسیٰ نے دعا کی: اللّٰھم اجعلھا امتی (اے خدا اس کو میری امت بنا دے) ارشاد ہوا کہ میں نے تیری امت کو حکم فرمایا انھوں نے جواب میں "سمعنا و عصینا" کہا جبکہ امتِ محمد "سمعنا و اطعنا" کہتی ہے۔ اب موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا کہ یا الٰہی مجھے امتِ محمد میں شامل فرما دے۔ (شرح خواجہ ایوب۔ بحوالہ خلاصۂ مثنوی، ص ۲۳۰)

راستہ اس لیے دکھایا ہے کہ تو اس دَرَد سے دُور ہے، تو پاؤں پھیلا لے کہ یہ کلیم درا نہجے یعنی تو بھی اہل دیدار میں سے ہے اور ہر چند تیرا دور مقدم ہے لیکن از روئے کمال و قرب و معرفت تیری امت اس لائق نہیں کہ امتِ محمدیہ کے درجے کو پہنچے، اس لیے کہ یہ لوگ خاصانِ خدا اور مستانِ قربت ہیں اور ان کی آنکھیں مازاغ[8] کے سرمے سے روشن ہیں جبکہ تیری قوم کو بچھڑے کی آواز ہی گمراہ کر دیتی ہے — لہٰذا اس خواہش کو چھوڑ دے کہ تیری امت کے لیے یہ حد نہیں ہے[9]

اب عنایت و کریمیِ خداوند قدوس کے تذکرے اور حدیث "کنت کنزاً رحمۃ مخفیہ"... کے اقتباس کے بعد پھر حضرت رسالت مآبؐ کا ذکرِ سعادت اثر آگیا ہے۔ اس حصے میں مولانا نے حضور ختمی مرتبت کی اشاعتِ توحید کے لیے جدوجہد کی طرف اشارہ کیا اور اپنے دور کے افرادِ امت کی اس (توحید) سے دوری کا شکوہ کیا۔ کہتے ہیں کہ احمدِ مجتبیٰؐ کو دنیا میں بے شمار بُت توڑنے پڑے جب کہیں جا کر لوگ خدائے واحد کی طرف متوجہ ہوئے۔ پھر مولانا خطاب بہ مسلمین فرماتے ہیں کہ اگر حضور نے یہ جدوجہد نہ فرمائی ہوتی تو تم بھی آج اپنے اسلاف کی مانند پرستشِ اصنام میں مصروف ہوتے۔ حضورِ اکرمؐ ہی کے طفیل تمھارا سر سجدۂ صنم سے محفوظ رہا، تاکہ امتوں پر نبی کریم کا جو حق ہے وہ تم پر واضح ہو۔ سو تم اگر شکر ادا کرنا چاہتے ہو تو بتوں سے اس رہائی کا شکر ادا کرو کہ حضور نے تمھیں بت باطن سے بھی نجات دلائی۔ آگے چل کر مولانا نے اس میراث (توحید) سے امتِ مسلمہ کی بے توجہی کا شکوہ کیا ہے کہ جس شخص کو باپ کی میراث مفت میں ملی ہو اسے اس کی کیا قدر ہو سکتی ہے۔[10] دوسرے لفظوں میں وہ اس قسم کے مقلدِ موحد ظاہری بتوں کی پوجا سے تو پرہیز کرنے لگے ہیں لیکن چونکہ توحید نے دل پر سرایت نہیں کی اس لیے ان کے باطن میں صنم خانے موجود

---

۸ مازاغ: مازاغ البصر وما طغیٰ، سورۃ النجم، آیۃ ۱۷، (نگاہ نہ تو بہکی اور نہ حد سے بڑھی) تفصیل کے لیے پہلی ۱۸ آیات ملاحظہ ہوں۔

۹ خلاصہ مثنوی، ص ۲۴۰، ۲۴۱

۱۰ اکبر بادشاہ کے سوانح میں لکھا ہے کہ ایک روز وہ کسی جھروکے میں بیٹھے سامنے سے گزرنے والی خلقت کو دیکھ رہے تھے۔ ایک شخص کو دیکھا کہ وہ نہایت قیمتی دوشالے سے اپنا معمولی سا جوتا صاف کر رہا ہے۔ بادشاہ نے کہا کہ اس احمق کی اس حرکت کو دیکھو۔ نورتن سے پوچھا کہ تمھارے نزدیک اس حماقت کی کیا توجیہ ہے؟ بیربل نے کہا کہ جہاں پناہ میں عرض کرتا ہوں، یہ دوشالہ اس کو باپ سے ورثے میں ملا ہے اور جوتا اس نے اپنی کمائی سے خریدا ہے۔ اس شخص کو بلا کر دریافت کیا تو اس نے اس کی تصدیق کی۔ (تلمیحات رومی، ص ۱۵۵)

ہیں۔ ورثے میں حاصل کردہ توحید کی بدولت ان کو اب ایک ضروری قدم آگے بڑھانا چاہیے کہ باطن کے بتوں سے بھی ان کو نجات ملے ؎[لہ]

احمد اخود کیست اسپاہِ زمین ... ماہ بین بر چرخ و بشکافش جبین
تا بداند سعد و نحس بی خبر ... دور تست این دور، نی دور قمر
دور تست این را کہ موسی کلیم ... آرزو می بُرد زین دورت مقیم
چونکہ موسیٰ رونقِ دورِ تو دید ... کاندر و صبح تجلی می دمید
گفت یارب این چہ دور رحمتست ... آن گذشت از رحمت اینجا رؤیتست
غوطہ دہ موسیٰ خود را در بحار ... از میان دورۂ احمد بر آر
گفت یا موسیٰ بدان بنمودمت ... راہ آن خلوت بدان بگشودمت
کہ تو زان دوری دریں دورای کلیم ... پا بکش زیرا درازست این گلیم
کنت کنزاً رحمۃً مخفیۃً ... فانبعثت امۃً مہدیۃ
ہر کرامالی کہ می جوئی بجان ... او نمودت تا طمع کردی در آن
چند بت احمد شکست اندر جہان ... تا کہ یا رب گوی گشتند امتان
گر نبودی کوششِ احمد، تو ہم ... می پرستیدی چو اجدادت صنم
این سرت وارست از سجدہ صنم ... تا بدانی حقِ او را بر امم
گر بگوئی، شکر این رستن بگو ... کز بتِ باطن ہمت برہاند او
مر سرت را چون رہانید از بتان ... ہم بدان قوت تو دل را وا رہان
سر ز شکر دین از آن بر تافتی ... کز پدر میراث مفتش یافتی
مردِ میراثی چہ داند قدرِ مال ... رستمی جان کند و مجان یافت زال[لہ]

اس حصے کے ساتھ ہی ایک صوفی شیخ احمد خضرویہ کے حلوا خریدنے کی داستان ہے جس میں فخرِ موجودات کو پیغمبر کہہ کر آپ کا ایک قول بیان کیا گیا ہے۔ سرکارِ دوعالم نے فرمایا کہ دو فرشتے بازاروں میں ہمیشہ یہ ندا دعا کرتے

لہ تشبیہات رومی، ص ۱۰۵
لہ کتاب مثنوی، ص ۱۱۴، ۱۱۵

رہتے ہیں کہ یا اللہ العالمین مخیر و منفق اصحاب کی نسل میں اضافہ کر اور بخیل و ممسک افراد کو ملیامیٹ فرما۔ ان اربابِ انفاق و سخا کے لیے خاص طور پر دعا کی گئی ہے جنھوں نے جان کی قربانی دی اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی طرح اس مقصد کے لیے اپنی گردنیں پیش کیں لیکن چھری ان پر کارگر نہ ہو سکی۔ اس سے اگلے شعر میں گویا اس قرآنی آیت کا ترجمہ پیش کیا گیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اللہ کی راہ میں شہید ہونے والے زندہ ہیں انھیں مردہ نہ کہو[۱۳]

گفت پیغمبر کہ در بازارہا — دو فرشتہ می کنند دایم ندا
کای خدا تو منفقان را دہ خلف — وی خدا تو ممسکان را دہ تلف
خاصہ آن منفق کہ جان انفاق کرد — حلق خود قربانیِ خلاق کرد
حلق پیش آورد اسمٰعیل وار — کارد بر حلقش نیارد کرد کار
پس شہیدانِ زندہ زان رویند و خوش — تو بدان قالب بمنگر گبر وَش[۱۴]
چون خلف دادستشان جان بقا — جان ایمن از غم و رنج و شقا[۱۵]

ایک طامع مفلس قیدی کی داستان میں عمدہ و نیک خیالات اور صبر کے فوائد بیان کرتے ہوئے مولانا۔ ختم المرسلینؐ کا حوالہ دیا ہے۔ بقول مولانا اگر اللہ تعالیٰ انسان کو "خیالاتِ خوش" کے ساتھ مار دکر دم میں رکھے تو وہ بھی اس کے مونس و ہمدرد بن جائیں گے، اور صبر میں جاذبیت و شیرینی، جو انسان کے لیے فر تازگی کا سامان بہم پہنچاتی ہے، ایسے ہی خیالات سے پیدا ہوتی ہے۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب انسان حاملِ ایمان ہو۔ گویا ان سب راحتوں اور خوبیوں کا منبع و سرچشمہ ایمان ہے۔ اگر ایمان ضعف و کمزوری ہے تو مایوسی اور رنج و ناامیدی اس کا مقدر جانو۔ صبر کو جو عزت و سرخروئی حاصل ہے تو یہ بھی ایمان ہی بدولت ہے۔ یہاں مولانا نے سرورِ کونین کی حدیث "مَن صبر لہ لا ایمان لہ"[۱۵] (جو کوئی صاحبِ صبر صاحبِ ایمان نہیں) کو ایک عربی مصرع میں بیان کرنے کے بعد اسے فارسی کے قالب میں ڈھالا ہے۔ انسان کے ظن اور سوئے ظن کے بارے میں اظہارِ خیال کیا ہے :

---

[۱۳] سورہ البقرہ، ۱۵۴ — اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کیے جاتے ہیں ان کی نسبت یوں بھی مت کہو کہ وہ مُردہ ہیں بلکہ وہ تو (ایک ممتاز حیات کے ساتھ) زندہ ہیں لیکن تم (ان حواس سے اس حیات کا) ادراک نہیں کر سکتے۔

[۱۴] کتاب مثنوی، ص ۱۱۵ — [۱۵] مثنوی شریف، دفتر دوم، حاشیہ، ص ۱۵۱

صبر شیرین از خیال خوش شد است — کآن فرج و آن تازگی پیش آمد است

آن فرج آید ز ایمان در ضمیر — ضعف ایمان نا امیدی و زحیر

صبر از ایمان بیابد سر کله — حیث لا صبر فلا ایمان له

گفت پیغمبرؐ "خداش ایمان نداد — ہر کرا نبود صبوری در نہاد"

آن یکی در چشم تو باشد چو مار — ہم وی اندر چشم آن دیگر نگار

زانکہ در چشمت خیال کفر اوست — وآن خیال مومنی در چشم دوست

کاندریں یک شخص ہر دو فعل ہست — گاہ ماہی باشد او و گاہ شست[۱۱۱]

فی المناجات کے ذیل میں حضور اکرمؐ کو رسولؐ اور پیغمبرؐ کے الفاظ سے یاد کیا گیا ہے۔ اس حصے میں ایک جگہ ظاہر پرستوں کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ مولانا کے نزدیک یہ ظاہر پرست گویا اندھے ہیں جنھیں گدھا تو نظر نہیں آتا لیکن ڈنڈے وہ اس کے پلان پر مارتے ہیں۔ رومی لفظ "خر" کی رعایت سے اس کے بعض متعلقات و فوائد کا ذکر کرتے ہوئے ظاہر پرستوں کو معنویت و باطن پرستی کی تلقین کرتے ہیں۔ ان کے مطابق خرِ نفس پر جو انسان کے قابو سے نکل کر دوڑ دوڑا اٹھتا ہے، پوری طرح قابو پانے کی ضرورت ہے۔ اسے بہرحال صبر و شکر کا بوجھ اٹھانا ہے۔ یہاں مولانا نے سورۂ فاطر کی ایک آیت (کوئی نفس کسی دوسرے کے گناہ کا بوجھ نہ اٹھائے گا) کی طرف اشارہ کیا اور بعد میں سعی و عمل کی ترغیب دلائی ہے۔ بغیر کوشش و عمل کے کسی چیز کی طمع رکھنا خام خیالی اور باعث رنج و آزردگی ہے۔ یہ کہنا کہ فلاں شخص کو اچانک، یعنی دست و پا ہلائے بغیر، خزانہ مل گیا ہے تو مجھے بھی اسی طرح مل جائے، میں محنت و مشقت کیوں کروں، سراسر بےہودہ بات ہے، یہ تو بخت[۱۱۲] کا معاملہ ہے اور بخت ہمیشہ ایسا نہیں رہتا، لہٰذا جب تک جسم میں طاقت و توانائی ہے محنت سے کام کرو۔ حصولِ گنج میں کوئی چیز مانع نہیں ہے۔ جہدِ مسلسل اور مشقتِ پیہم کے طفیل خزانہ خود بخود کھنچا چلا آئے گا۔

اس کے بعد مولانا نے سرورِ والا مقام کی حدیثِ مبارک — "مد اگر ہے بچو کہ یہ کارِ شیطان ہے" — کے حوالے

---

[۱۱۱] کتاب مثنوی، ص ۱۲۰ — مثنوی شریف، دفتر ۲، ص ۱۵ — خلاصہ مثنوی، ص ۱۸۱

[۱۱۲] مرحوم بدیع الزمان فروزانفر لکھتے ہیں: بخت در اصطلاح حکیمان حادثہ ایست کہ علت آن مجہول باشد و مربوط بہ امور نادر و اتفاقی است نہ کلی و اکثری و بہمین جہت میفرماید کہ نادر آن ہم نادر است (خلاصہ مثنوی، ص ۲۹۸)

سے "اگر مگر" سے بچنے کی تلقین کی ہے ۔ اس ضمن میں "تشبیہاتِ رومی" سے چند سطور ملاحظہ ہوں :

"کاہلوں کی تمنائیں بھی لاحاصل ہوتی ہیں اور ان کی پشیمانیاں بھی بے معنی ہوتی ہیں۔ ان کی طبیعت میں اگر مگر بہت ہوتا ہے۔ اگر میں امیر کے گھر پیدا ہوتا تو فیاضی کے یہ یہ کام کرتا اور یوں یوں لطف اٹھاتا۔ اگر حالات مساعد ہو جائیں تو میں بھی کچھ کمال کر کے دکھاؤں۔ اگر اسباب میسر آئیں تو میں قوم کی بڑی خدمت کروں۔ مولانا کہتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمایا کہ اس قسم کا اگر مگر اور تذبذب منافق کی علامت ہے۔ مومن فرض شناس ہو کر ہر حالت میں اطمینان سے کام کرتا ہے اور نیکی کرنے کے لیے شرائط کا طالب نہیں ہوتا۔ منافق کو جب موت آئے گی تو کہے گا کہ اے رب اگر تو مجھے مہلت دے تو میں خیرات دیا کروں اور نیک بن جاؤں :
لولا أخرتنی الی اجل قریب فاصدق واکن من الصالحین۔ یہ اگر مگر کرنے والے بہانہ جو ہوتے ہیں[۱۳]

حرف قرآن را ضریران معدنند — خر نبینند و بپالان بر زنند
چون تو بینائی پی خر رو که جست — چند پالان دوزی ای پالان پرست
خر چو هست آید یقین پالان ترا — کم نگردد نان چو باشد جان ترا
خر چو باشد کم نیابد ای عمو — خود به پشتش رہ نہد پالان او
پشتِ خر دکان و مال و مکسب است — جان تو سرمایهٔ صد قالب است
خر برهنه بر نشین ای بوالفضول — خر برهنه نی که راکب شد رسول
النبی قد رکب معروریاً — والنبی قیل سافر ماشیاً
بلکه آن شه بس پیاده رفته است — بار این و آن بسی پذرفته است
شد خر نفس تو بر میخش ببند — چند گریزد ز کار و بار، چند
بار صبر و شکر او را بردنی ست — خواه در صد سال خواهی سی و بیست
هیچ وازر وزر غیری بر نداشت — هیچ کس ندرود تا چیزی نکاشت
طمع خامست این مخور خام ای پسر — خام خوردن علت آرد در بشر
کان فلانی یافت گنجی ناگهان — من هم آن خواهم چه اجویم دکان

---

۱۳ تشبیہاتِ رومی، ص ۱۹۱

کار بخشست آن و آنہم نادر است | کسب باید کرد تا تن قادر است
کسب کردن گنج را مانع کی ست | پا مکش از کار آن خود در پی ست
تا نگردی تو گرفتار «اگر» | کہ اگر این کردمی یا آن دگر
کز «اگر» گفتن رسول با وفاق | منع کرد و گفت آن ہست از نفاق
کان منافق در «اگر» گفتن بمرد | وز «اگر» گفتن بجز حسرت نبرد
ای بسا کس مردہ در بوک و مگر | از جمال عافیت ناخوردہ بر [19]

حسد کے عیوب و نقصانات بیان کرکے اس سے بچنے کی تلقین کی ہے اور اس ضمن میں نبی کریمؐ کا ذکر کیا ابوجہل کا نام لیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ یہ کہنا کہ میں فلاں سے کم تر ہوں، احساس کمتری اور حسد کی علامت ہے اور حسد کئی خرابیوں اور نقصانات کی جڑ اور تمام برائیوں سے بد تر ہے۔ اسی احساس کمتری کے سبب ابلیس نے خود کو ذلتوں کا شکار بنالیا۔ اس نے بلندیوں کو چھونا چاہا لیکن پستیوں میں جاگرا۔ اسی طرح ابوجہل نے حسد کے باعث خود کو (نعوذ باللہ) حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑا ثابت کرنا چاہا لیکن اس کا نتیجہ برعکس نکلا اور وہ بوالحکم سے کہ اس کا نام تھا، بوجہل بن گیا۔ اس حسد نے بڑے بڑے ارباب اہلیت کو نا اہل بنا کر چھوڑا۔ اس کے بعد مولانا نے خلق و خوئے نیک کو سب سے عمدہ "اہلیت" قرار دے کر بعثت انبیا کو حسد وغیرہ دور کرنے کا وسیلہ بنایا ہے:

تو حسودی کز فلان من کمترم | می فزاید کمتری در اخترم
خود حسد نقصان و عیب دیگر ست | بلکہ از جملہ کمیہا بدتر است
آن ابلیس از ننگ و عار کمتری | خویشتن افکند در صد ابتری
از حسد میخواست تا بالا بود | خود چہ بالا بلکہ خون پالا بود
آن ابوجہل از محمدؐ ننگ داشت | وز حسد خود را ببالا میفراشت
بوالحکم نامش بد و بوجہل شد | ای بسا اہل از حسد نا اہل شد
من ندیدم در جہان جستجو | ہیچ اہلیت بہ از خلق نکو
انبیا را واسطہ زان کرد حق | تا پدید آید حسدہا در قلق [20]

---

[19] کتاب مثنوی، ص ۱۲۳ — مثنوی شریف دفتر ۲، ص ۱۸ [20] ایضاً، ص ۱۲۵ — ایضاً، ص ۲۰

ملکہ سبا، بلقیس کے پاس حضرت سلیمان کی طرف سے ہدہد کی پیغام رسانی کے واقعے میں مولانا نے محسوسات پرستی کو ہدفِ تنقید بناتے ہوئے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو محمدؐ اور احمدؐ کے اسما سے یاد کیا ہے:

عقل با حس زین طلسمات دو رنگ　　چون محمدؐ با ابوجهلان بجنگ
کافران دیدند احمد را بشر　　چون ندیدند از وی انشق القمر
خاک زن در دیدهٔ حس بین خویش　　دیدهٔ حس دشمن عقلست و کیش
دیدهٔ حس را خدا اعماش خواند　　بت پرستش گفت و ضد ماش خواند
زانکه او کف دید و دریا را ندید　　زانکه حالی دید و فردا را ندید[۲۱]

مثنوی رومی میں حضور نبی کریمؐ کے ساتھ ابوجہل کا ذکر کئی جگہ آیا ہے۔ دفترِ اول سے متعلق مقالے میں اس کی دو تین مثالیں گزر چکی ہیں۔ مثلاً ایک جگہ مولانا نے یہ واضح کرنے کے لیے کہ ہر کوئی اپنی فکر و ہمت کے مطابق سوچتا ہے، سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ابوجہل اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، کے اقوال اور حضورؐ اکرم کے دونوں اقوال کو صحیح قرار دینے کا ذکر کیا ہے[۲۲] دفترِ دوم میں آئینۂ دل کی صفائی کے ذکر میں ایسی ہی باتیں کسی قدر مختلف انداز میں بیان ہوئی ہیں۔ فرماتے ہیں کہ باطل کو باطل اور عاطل کو عاطل اپنی طرف کھینچتا ہے۔ یعنی ہر جنس کی توجہ اپنی جنس ہی کی طرف ہوتی ہے۔ کبھی یہ بھی ہوا کہ گائے شیرِ نر کی طرف مائل ہوئی ہو۔ پھر مولانا نے دو قرآنی قصوں[۲۳] کے حوالے سے یہ کہنا چاہا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی فطرتِ بد سے ہٹ کر دردِ عشق سے سرشار ہو جائے تو اسے محرمِ اسرار کی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر اصحابِ کہف کے کتے کا نام لیا جا سکتا ہے، جو تھا تو ایک نجس پلید کتا لیکن عاشقان و طالبانِ حقیقت سے وابستہ رہنے کے سبب اس کا شمار بھی افضلِ مخلوقات میں ہوا۔ اس ضمن میں شیخ سعدی کا قول بھی ملاحظہ ہو:

با بدان یار گشت همسر لوطؑ　　خاندانِ نبوتش گم شد
سگ اصحابِ کهف روزی چند　　پی نیکان گرفت و مردم شد[۲۴]

اس کے بعد رومی نے سرورِ عالی مقام صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابوبکر اور ابوجہل کا ذکر کر کے بتایا ہے

---

[۲۱] کتاب مثنوی، ص ۱۴۵
[۲۲] کتاب مثنوی، ص ۶۳
[۲۳] یوسف اور بھیڑیے اور اصحابِ کہف کے کتے سے متعلق
[۲۴] کلیاتِ سعدی (گلستان)، چاپ ایران، ص ۸۴

کہ ارباب صدق وصفا کے لیے نبی اکرمؐ کی ذاتِ والا صفات سراپا صدق وصفا تھی، لیکن جن لوگوں کے اپنے دل کجی اور مرض کا شکار تھے وہ حضور اکرمؐ کے معجزات دیکھ کر بھی حضورؐ پر ایمان لانے کی طرف راغب نہ ہوئے۔ آخر میں مولانا فرماتے ہیں کہ آئینۂ دل کا صاف وشفاف ہونا ضروری ہے تاکہ خوب و بد میں تمیز کرنے کی اہلیت پیدا ہو سکے:

باطلان را چہ رباید باطلی   عاطلان را چہ خوش آید عاطلی
زانکہ ہر جنسی رباید جنس خود   گاؤ سوی شیر نر کی رو نہد
گرگ بر یوسف کجا عشق آورد   جز مگر از مکر، تا او را خورد
چون ز گرگی وارہد محرم شود   چون سگ کہف از بنی آدم شود
چون محمدؐ را ابو بکرؓ نکو   دید صدقش، گفت "ھذا صادقٌ"
چون ابو بکرؓ از محمدؐ بُرد بُو   گفت "ھذا لیس وجہٌ کاذبٌ"
چون نُبد بوجہل از اصحاب درد   دید صد شقّ قمر باور نکرد
دردمندی کش ز بام افتاد طشت   زو نہان کردیم حق پنہان نگشت
وآنکہ او جاہل بُد از دردش بعید   چند بنمودیم و او آنرا ندید
آئینۂ دل صاف باید تا در او   وا شناسی صورت زشت از نکو[25]

ایک احمق شخص اور چاپلوس ریچھ کی داستان کے دوسرے حصے میں حضور نبی کریمؐ کا ذکر سعادت اثر دو تین مرتبہ احمدؐ کے نام سے ہوا اور ہر مرتبہ خطاب کا انداز اختیار کیا گیا ہے۔ اس حصے میں احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی دو احادیث کا بھی حوالہ آیا ہے، اور اس میں آمدہ اشعار گویا سورۂ عبس کی تفسیر ہیں۔

ایک ریچھ کو کسی اژدہا نے جکڑ لیا۔ کسی آدمی کا ادھر سے گزر ہوا، اس نے ترس کھا کر ریچھ کو اژدہا سے رہائی دلا دی۔ ریچھ اس آدمی کے ساتھ ہو لیا۔ کسی دوسرے شخص نے جو یہ منظر دیکھا تو اس آدمی کو سمجھایا کہ میاں ریچھ کی دوستی اچھی نہیں، اس کی چاپلوسی پر نہ جانا، یہ تمھیں نقصان پہنچائے گا۔ لیکن اس آدمی نے اس نصیحت کی کوئی پروا نہ کی۔[26]

---

[25] کتاب مثنوی، ص ۱۵۶ — مثنوی شریف دفتر ۲، ص ۴۸

[26] مخطوطہ مدانی والا حصہ زیر بحث حصے کے بعد آیا ہے صرف تسلسل برقرار رکھنے کے لیے اسے یہاں نقل کیا گیا ہے

(چنانچہ وہی نتیجہ ہوا جس کا اظہار اس شخص نے کیا تھا- ایک جگہ پر وہ آدمی سو گیا اور ریچھ مکھیاں اڑانے میں مصروف ہو گیا۔ مکھیاں بار بار اس پر آکر بیٹھتیں۔ آخر تنگ آکر ریچھ قریبی پہاڑ سے ایک بڑا سا پتھر اٹھا لایا اور مکھیوں کو ختم کرنے کی خاطر اس نے وہ پتھر دھڑام سے سوتے ہوئے آدمی پر دے مارا جس سے وہ وہیں ختم ہو گیا۔ دوسرے لفظوں میں بے وقوف کی دوستی جان لیوا ثابت ہوئی)۔

اس پس منظر کے ساتھ اور ایک قرآنی حوالہ پیش کرتے ہوئے مولانا نے یہ نکتہ پیش کیا ہے کہ جاہلوں اور عقل کے اندھوں پر پند و موعظت کا کچھ اثر نہیں ہوتا، لہٰذا ان سے منہ موڑ لو اور جو واقعی طالب رشد و ہدایت ہیں ان کی طرف توجہ کرو- اس ضمن میں ایک قرآنی تلمیح پیش کی گئی ہے- مولانا اشرف علی تھانوی مرحوم "کلیدِ مثنوی" کے حوالے سے رقم طراز ہیں۔ "ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعض رؤسائے مشرکین کو سمجھا رہے تھے کہ اتنے میں عبداللہ ابن مکتوم نابینا صحابی حاضر ہوئے اور کچھ پوچھنا شروع کیا۔ یہ قطع کلام آپؐ کو ناگوار ہوا اور آپ نے ان کی طرف التفات نہ فرمایا اور ناگواری کی وجہ سے آپ چیں بجبیں ہوئے۔ جب آپؐ اس مجلس سے اٹھ کر گھر جانے لگے تو یہ آیتیں[۲۷] نازل ہوئیں۔ اس کے بعد جب حضرت عبداللہ ابن مکتوم آپؐ کے پاس آتے تو آپ بڑی خاطر کرتے۔"[۲۸]

اس تفصیل کے بعد مثنوی کے متعلقہ حصے کو سمجھنا آسان ہو جائے گا- مولانا فرماتے ہیں کہ اس شریف آدمی نے اس بے وقوف (ریچھ والے) کو مزید نصیحت کرنا ترک کیا اور لاحول پڑھتا ہوا آگے نکل گیا اور کہنے لگا کہ جب اس پر پند و موعظت کا اثر الٹا ہی ہو رہا ہے تو یہ طریقہ ہی ختم کر دو اور یوں اس نے "فاعرض عنہم"[۲۹] کا دامن تھام لیا اس لیے کہ جس دوا سے مرض میں اضافہ ہوتا ہو تو اس دوا کا ترک کرنا ہی بہتر ہے- اس سلسلے میں "سورہ عبس" کے مطابق طالب ہی کی طرف توجہ کرنی چاہیے- جب ایک نابینا حق کی تلاش میں آیا ہے تو اسے غریب جانتے ہوئے اس کی دل آزاری کرنا اچھی بات نہیں- آپؐ کی یہ خواہش ہے کہ آپؐ رؤسا کو راہِ رشد و ہدایت پر لائیں تاکہ عوام مردم ان سے کسبِ علم کریں- اے احمدؐ! (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ نے جب یہ دیکھا کہ چند رؤسا اور سرداروں نے آپؐ کو سنا ہے تو آپؐ خوش ہو گئے کہ شاید یہ سردار دین کے اچھے حامی بن جائیں، اور چونکہ یہ عرب و حبش کے سردار ہیں، ان کی بدولت آوازۂ دینِ اسلام چار دانگ عالم میں پھیل جائے گا کہ: الناس علی دین ملوکھم۔

---

[۲۷] ملاحظہ ہو سورۂ عبس، آیات ۱-۴ [۲۸] تفاسیر و احادیث

[۲۹] سورۂ سجدہ، آیۃ: ۳۰- فاعرض عنہم وانتظر انہم منتظرون (سو آپ ان کی باتوں کا خیال نہ کیجیے اور آپ

اور شاید اسی بنا پر آپؐ نے اس طالب ہدایت نابینا سے منہ پھیر لیا اور دل تنگ ہوئے۔

لے احمدؐ! خدا کے نزدیک یہ ایک اندھا سینکڑوں قیصروں اور وزیروں سے بڑھ کر ہے۔ یہاں مولانا روم حضورِ اکرم ہی کی حدیثِ مبارک کے حوالے سے عوام الناس کو، سونے چاندی کی کانوں کی طرح، کانیں قرار دے کر بعض کانوں کی دوسری کانوں پر، دوسرے لفظوں میں بعض انسانوں کی دوسرے انسانوں پر برتری بیان کرتے ہیں۔ مثلاً لعل و عقیق کی کان تانبے کی ہزاروں کانوں سے بڑھ کر ہے۔ اس جگہ گویا خدا پھر خطاب بہ سرورِ کونینؐ فرماتا ہے کہ یہاں (حضورِ حق) مال و دولت کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ یہاں تو درد و عشق کے مارے دلوں کی قدر و منزلت ہے۔ وہ نابینا صاحبِ درد و روشن دل تھا۔ ایسے اہل اور حق دار کو رشد و ہدایت سے نوازنا ضروری ہے۔ اس کے برعکس اگر چند جاہل لوگ آپؐ کی نبوت کے منکر ہیں تو آپ کو چنداں ناراحت ہونے کی ضرورت نہیں۔ اور اگر چند احمق آپؐ کو متہم کرتے ہیں تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ خود خدا آپؐ کی گواہی دیتا ہے۔ اس کے بعد رومی نے ایسے جاہلوں کو چمگادڑ سے تشبیہ دی ہے، جو آفتاب کو دیکھنے کی ہمت نہ رکھنے کے سبب اس سے نفرت کرتی ہے:

آن مسلمان ترکِ آن ابلہ گرفت — زیرِ لب لاحول گویان رہ گرفت
گفت "چون از جد و پند و از جدال — در دلِ او بیش می زاید خیال
پس رہِ پند و نصیحت بستہ شد — امرِ اَعرِض عَنہُم پیوستہ شد
چون دوایت می فزاید درد، پس — قصہ با طالب بگو برخوان عبس"
چون کہ اعمیٰ طالبِ حق آمدہ است — بہرِ فقر او را نشاید سینہ خست
تو حریصی بر رشادِ مہتران — تا بیاموزند عام از سروران
احمدا! دیدی کہ قومی از ملوک — مستمع گشتند، گشتی خوش کہ بوک
این رئیسان یارِ دین گردند خوش — بر عرب اینہا سرند و بر حبش
بگزرد این صیت از بصرہ و تبوک — زانکہ "الناس علیٰ دینِ الملوک"
زین سبب تو از ضریر مہتدی — رو بگردانیدی و تنگ آمدی
مزد حرم میگردیم در وقتِ تنگ — این نصیحت میکنم نز خشم و جنگ
احمدا! نزدِ خدا این یک ضریر — بہتر از صد قیصر است و صد وزیر

یاد «الناس معادن» چون بیار — معدنی باشد فزون از صد ہزار
معدن لعل و عقیق مکتنس ... — بہتر است از صد ہزاران کان مس
احمدا اینجا ندارد مال سود — سینہ باید پر ز عشق و درد و دود
اعمی روشندل آمد در مبند — پند او را دہ کہ حق اوست پند
گر دو سہ ابلہ ترا منکر شوند — تلخ کی گردی کہ ہستی کان قند
گر دو سہ احمق ترا تہمت نہد — حق برای تو گواہی می دہد
گفت از اقرار عالم فارغم — آنکہ حق باشد گواہ، او را چہ غم[تلہ]

(باقی آئندہ)

تلہ کتاب مثنوی، ص ۱۵۶ ـ مثنوی شریف دفتر ۲، ص ۴۸

مطالعہ قرآن

مولانا محمد حنیف ندوی

اس کتاب میں مولانا ندوی نے قرآن سے متعلق ان تمام مباحث و مسائل پر محققانہ اظہار خیال کیا ہے جن نہ صرف قرآن فہمی میں خصوصیت سے مدد ملتی ہے، بلکہ اس کتاب ہدیٰ کی عظمت بھی نکھر کر سامنے آجاتی ہے مزید برآں اس سے قرآن کے علوم و معارف اور دعوت و اسلوب کی معجزہ طرازیوں پر بھی تفصیل سے روشنی پڑتی اس کتاب میں مولانا نے زرکشی کی البرہان اور سیوطی کی الاتقان کے ان تمام جواہر ریزوں کو اپنے مخصوص شگفتہ او حکیمانہ انداز میں جمع کر دیا ہے اور مستشرقین کے اٹھائے ہوئے اعتراضات کا تسلی بخش جواب بھی دیا ہے قلب و ذہن میں شکوک و شبہات ابھارنے کا موجب ہو سکتے ہیں۔ غرض اسے قرآنی فکر و تصور کے بارے میں ا انسائیکلوپیڈیا کہنا چاہیے جس میں وہ ساری بحثیں اور مضامین سمٹ آئے ہیں جن کی دورِ حاضر کو ضرورت ہے

قیمت: ۳/- روپے

ملنے کا پتا: ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ لاہور